کرتے ہیں۔اس شغلِ حسین کے بعد آپ کبھی کبھی ''سیف الملوک'' کا درس بھی دیتے ہیں اوراس قندونبات شاعری سے سامعین کومحظوظ فرماتے ہیں۔آج کل ہمزاد کوقابو میں لانے کے لئے ایک قدِآدم آئینہ کے سامنے بعض خاص قسم کے اذکار کررہے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کونا کام کرے۔محمد صالح صاحب کے گھر کے سامنے ایک مولوی صاحب کا گھر ہے۔یہ صاحب زمانے کی موجودہ مشین کے صحیح کل پرزے ہیں اور حکمت اور کیمیا میں دخل رکھنے کے علاوہ پاکستان اورانڈیا کے جملہ واقعات کے عینی شاہد ہیں۔بات میں سے بات نکالنا اوراس میں داستان امیر حمزہ کا رنگ بھرنا آپ کا خاص کمال ہے۔اس کے علاوہ آپ کی ذاتِ والا صفات کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ ذکر کرتے کرتے ایسے حسین انداز میں خواب خرگوش کا پارٹ ادا کرتے ہیں کہ دیکھنے والا بیداری اورخواب میں ذرا بھی امتیاز نہیں کرسکا۔ان کے علاوہ ڈیرہ میاں صاحب میں عموصاحب کا ایک پروردہ خادم میاں اللہ دتہ بھی رہتا ہے جو بذلہ سنجی اورحاضر جوابی کے علاوہ ایک ہی وقت میں رونے اور ہنسنے کا پارٹ اس خوبی سے ادا کرتا ہے کہ دیکھنے والا اس کے کمال کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔یہ اگرچہ بوڑھا ہوچکا ہے مگر

مرد چوں پیر شود حرص جواں می گردد

کے مطابق اپنے بڑھاپے کو بہلانے کے لئے کسی لعبتِ چین کا خواہشمند ہے۔چند

روز کی بات ہے کہ موسمی بخار نے ڈیرے کے دوسرے سکان کے ساتھ اسے بھی آدبایا۔ اس وقت اس کی زبانِ فحش ترجمان سے ایسے ایسے دوہے اور ڈھولے سننے میں آئے کہ بس روح کملا ہی گئی۔ کہتے ہیں کہ جب بھی ملیریا بخار اس کی زندگی کے ریکارڈ پر اپنی سوئی رکھتا ہے تو اسے قرآن کریم کی اکثر ایسی آیات یاد آجاتی ہیں جو زیادہ تر اُخروی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔

ڈیرہ میاں صاحب میں پیرزادہ شاہ حسن صاحب نقوی سے بھی تعارف ہوا۔ آپ خلیفہ حامد حسن صاحب مرحوم سابق وزیراعظم پٹیالہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور بخاری سادات میں سے صحیح النسب بزرگ ہیں۔ آپ نے اختلافِ عقائد کے باوجود مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اور پھر وطن پہنچ کر دوبارہ ارشاد فرمایا کہ میں جلد آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ چنانچہ آج تین ماہ کی اقامت کے بعد میرے کاروانِ زندگی نے ڈیرہ میاں صاحب سے کوچ کرنے کا عزم کیا اور شوقِ رحیل نے سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ کی نوبت بجائی ہے۔ عمو صاحب کی خواہش ہے کہ میں اپنے عزائم کو لاہور تک محدود رکھوں اور چند روز کے قیام کے بعد پھر اسی محور و مدار کے طواف کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ دیکھیں مشیت و مقدر کا ہاتھ عنانِ زندگی کو کس طرف پھراتا ہے۔

دھرا ہے ناقۂ لیلیٰ پہ محملِ رنگیں
کدھر مہار اٹھاتا ہے ساربان دیکھیں

بہرحال میں مردہ بدستِ زندہ ہوں اور مَاتَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کے فرمانِ ایزدی سے مجبور ڈیرہ میاں صاحب سے منڈی بہاؤالدین پہنچ چکا ہوں اور اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔صاحب محطہ نے اطلاع دی ہے کہ موجودہ سیل وتلاطم کی وجہ سے لاہور پہنچنے کی کوئی صورت نہیں مگر میرے نزدیک گھر سے نکلنے کے بعد شکستِ عزائم کا ارتکاب غیر مناسب ہے لہٰذا لالہ موسیٰ روانہ ہو رہا ہوں اور اس علاقہ پر الوداعی نظر ڈال رہا ہوں جسے حضرت علامہ نورالدینؓ اور سرسید احمد خان نے خطۂ یونان اور اقلیم ایران سے تشبیہہ دی تھی۔یعنی وہ گجرات اور اس کے مضافات جہاں ہماری وڑائچ قوم نے دس پشت سے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اس وقت گاڑی میں بیٹھا اس کی رواروی کا ترنم سن رہا ہوں۔تھوڑی دیر کے بعد ڈنگہ آ گیا ہے اور اس شہر کی میٹھی سونف کے گشتی تاجر ہمارے ڈبے کے سامنے کھڑے ہو کر اس متاعِ ہاضوم کو بیچنے کے لئے اونچے نیچے سروں میں اس کی ثناخوانی کر رہے ہیں۔پرانے لوگوں کا اس شہر کی وجہ تسمیہ کے متعلق خیال ہے کہ یہ نام ڈِنگہ بمعنی ٹیڑھا نہیں بلکہ ''دین گاہ'' کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔کیونکہ آج سے بہت عرصہ پہلے یہ شہر علومِ دینیہ کی

مشہور درس گاہ رہ چکا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اب گاڑی وِسل دے کر سوئے لالہ موسیٰ رواں دواں ہے اور جوڑا کرنانہ کا اسٹیشن جو گجر قوم کی طرف منسوب ہے اس کا دستِ طلیعہ دکھائی دے رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ گُجر گاؤ چر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ قوم وسطِ ایشیا سے اس ملک میں آئی تھی۔ اور اس کے مختلف قبائل جو تہال، ڈوگے اور کھادی کہلاتے ہیں اس نواح میں اترے تھے۔ آرین نسل چونکہ بہت زور آور تھی اس لئے یہ قوم اس کے مقابلہ سے عاجز آ کر پہاڑی علاقوں میں پناہ گزین ہوگئی اور پھر امنِ عامہ ہونے پر میدانی علاقوں میں اتر آئی۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

اس وقت گاڑی لالہ موسیٰ پہنچ چکی ہے اور میں پلیٹ فارم سے اتر کر ٹکٹ گھر کے سامنے کھڑا ہوں اور بابو صاحب کی اس اطلاع پر کہ سیلاب کی وجہ سے گاڑی لاہور نہیں جائے گی، اپنے عزائم کی گتھیاں سلجھا رہا ہوں۔ اور پھر اس خیال سے کہ سندھ ایکسپریس کندیاں اور مظفر گڑھ سے ہو کر ملتان اور کراچی جانے والی ہے لودھراں کا ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو چکا ہوں اور اس کی تیز روی کے ساتھ ساتھ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کا نظارہ دیکھ رہا ہوں اور کسی شاعر کی یہ رباعی گنگنا رہا ہوں۔

پیچھے ہے میرے قافلۂ حسرتِ یک عمر
آگے میرے وہ شب ہے سحر جس کی نہیں ہے
بے سود ہے اندازۂ مستقبلِ ہستی
ہونا ہے وہی ہم کو خبر جس کی نہیں ہے

معلوم نہیں یہ رباعی میرے تحت الشعور سے اٹھ کر پردہ شعور پر کیسے آگئی ہے اور میں آپ کی یاد کو ستم ہائے روزگار سے کیوں نسبت دے رہا ہوں۔

بہر حال اس وقت میل گاڑی کی برق رفتاری اور چھوٹے سٹیشنوں کے منتظر مسافروں کی مایوسی دل پر عجیب چرکے لگا رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ آج میں بھی ان مسافروں کی طرح ایک روحانی میل گاڑی سے بچھڑ کر اپنی منزلِ مقصود سے محروم ہو چکا ہوں اور نہ معلوم ابھی کتنا عرصہ اسی حسرت کا شکار رہوں گا۔

یارانِ تیزگام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اس وقت اگرچہ میری آنکھوں کے سوکھے ہوئے چشمے آنسو بہانے سے قاصر ہیں مگر درد کی وہ کسک جو گاڑی کے چنگ و رباب کے ساتھ میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے حیطۂ الفاظ سے باہر ہے۔ کاش میرا خدا میری دبی ہوئی فریادوں کو نالہائے رسا کی شکل میں بدل دے اور میں پھر اسی کھوئی جنت میں آباد ہو سکوں۔

اس وقت سرگودہا کا شہر قریب آ گیا ہے اور اسٹیشن کے برقی قمقمے اس وقفۂ قیام کا پتہ دے رہے ہیں جو لمبے سفر کے بعد مسافروں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ شہر ''گودہا'' نامی ایک بھنگی کے سر، یعنی تالاب کے نام پر سرگودہا مشہور ہو گیا ہے۔ بہر کیف تقدیر کے اس بھید کو کون سمجھ سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کے مٹتے ہوئے ناموں میں سے ایک بھنگی کا نام یوں بامِ شہرت پر پہنچے گا اور اس کے نام پر ایک شہر آباد ہو جائے گا۔

یہاں سے اٹھائیس میل کے فاصلہ پر مجھے پھر وہی بستی نظر آ رہی ہے جہاں سے قسامِ ازل نے میری قسمت میں ہجرت لکھی تھی۔ میں گوناگوں پریشانیوں کے باوجود اس بستی سے وہی محبت رکھتا ہوں جو موجودہ حالات سے قبل میرے دل و دماغ میں جاگزیں تھی اور اب بھی وہ گلیاں اور شاہراہیں اسی طرح آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں جس طرح آج سے ایک سال قبل۔ میں اس بستی میں کب واپس جاؤں گا یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے البتہ اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے اس کی محبت کو ہمیشہ حرزِ جاں بنائے رکھوں گا۔

اَلَا لَیْتَ شِعْرِیْ هَلْ اَبِیْتَنَّ لَیْلَةً

بِوَادٍ وَّحَوْلِیْ اَذْخَرٌ وَّجَلِیْلُ

اس جدائی کا اگر مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں اس وادی میں ایک رات اور بسر کر لیتا

جہاں میرے اردگرد اذخر اور جلیل کے پودے تھے۔ یہ شعر ہجرت کے بعد حضرت بلالؓ اکثر پڑھا کرتے تھے۔

اب گاڑی سرگودھا سے الوداعی وِسل دے کر اسی برق رفتاری سے خوشاب کی طرف جا رہی ہے۔ راستے میں دھریمہ کا اسٹیشن آ گیا ہے مگر گاڑی کی بے اعتنائی کا شکار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

یہ اسٹیشن ویسے تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا مگر اس لحاظ سے کہ یہ جگہ میرے والد بزرگوار کے خالہ زاد بھائی میاں احمد علی صاحب ننگیانہ کی جائے رہائش ہے میرے لئے ضرور باعثِ کشش ہے۔ کہتے ہیں کہ پرانے زمانہ میں کسی علاقہ کے مسلمانوں میں سے ایک بزرگ میاں حبیب سلطان جب کرانہ پہاڑی پر استغراقِ عبادت کی وجہ سے ظاہری پوشش سے عاری ہو گئے تو لوگوں نے ان کا نام 'ننگیانہ' رکھ دیا۔ اب ان کے خاص ارادت مندوں کی اولاد جو رؤسائے علاقہ میں شمار ہوتی ہے اسی لقب سے مشہور ہے۔ اور سرگودہا کے نواح میں کئی مواضعات پر حقوق مالکانہ رکھتی ہے۔

بہرکیف جس وقت دھریمہ کا اسٹیشن گزرا تو عہدِ گذشتہ کے وہ تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے آ گئے جب میرے والد بزرگوار کے خالو میاں اورنگ زیب ننگیانہ بقیدِ

حیات تھے اور میرے دادا مرحوم کے ساتھ آپ کے تعلقاتِ محبت قائم تھے۔

وے صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

گاڑی اسی تگاپو میں مصروف ہے اور دریائے جہلم سے گزر کر خوشاب کے اسٹیشن پر ستانے کی تیاری کر رہی ہے۔ لیجئے اب خوشاب آ گیا ہے اور ہم پنواڑی سے پان لے کر نیند کی یورشوں کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر وہ لطفِ خاص جو ایک دو مرتبہ اس سے قبل حاصل ہوا تھا میسر نہیں آ سکا۔ معلوم نہیں اس کی اصل وجہ پان کی خرابی ہے یا محفلِ گزشتہ کا فقدان۔ بہرحال پان زہر مار کرتے ہوئے شیر شاہ سوری کا زمانہ یاد آ رہا ہے جب وہ اس علاقہ میں فروکش ہوا اور یہاں کے میٹھے پانی کی وجہ سے اس شہر کو خوشاب کے نام سے موسوم کر گیا۔

اب تقریباً آدھی رات ہو چکی ہے اور گاڑی اسی طرح اپنے وظیفۂ رحیل میں پہیوں کی تسبیح چلا رہی ہے۔ سامنے حدِّ نظر تک بجلی کے کھمبے اور ان پر دودھیا رنگ کے قمقمے نظر آ رہے ہیں اور ان کے پہلو میں جوہر آباد اور قائد آباد وغیرہ شہر حکومتِ پاکستان کی کوششوں سے آباد ہو رہے ہیں۔ مجھے یہ آبادی دیکھ کر بہت تعجب ہوا کیونکہ چند سال قبل جب میں اس راستے سے پشاور گیا تھا تو اس لق و دق صحراء میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

کہتے ہیں کہ خانخاناں ایک دفعہ آگرہ سے برہان پور کو روانہ ہوئے۔ پہلی ہی منزل پر شامیانے کے نیچے اپنے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فقیر سامنے سے گزرا اور اس نے پکار کر کہا۔

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

انہوں نے خزانچی کو حکم دیا کہ 'لاکھ روپے دے دو۔' فقیر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ دوسری منزل پر فقیر پھر سامنے سے نکلا اور وہی شعر پڑھا۔ انہوں نے پھر کہہ دیا کہ 'لاکھ روپیہ دے دو۔' غرض وہ سات دن برابر اسی طرح آتا رہا اور روپیہ لیتا رہا۔ پھر خود ہی سوچا کہ یہ انعام آج تک کسی سے نہیں پایا۔ امیر ہے، ممکن ہے کسی دن طبیعت حاضر نہ ہو خفا ہو کر سب چھین لے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ آٹھویں دن خانخاناں پھر دربار لگا کر بیٹھے۔ معمول سے زیادہ دیر ہوگئی تو کہنے لگے 'آج وہ ہمارا فقیر نہ آیا۔' برہان پور آگرہ سے ستائیسویں منزل ہے۔ ہم نے تو پہلے دن ہی ستائیس لاکھ روپیہ خزانہ سے منہا کر دیا تھا۔ کم حوصلہ ہوگا معلوم نہیں دل میں کیا سمجھا۔

غرضیکہ میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا کندیاں اور وہاں سے مظفر گڑھ پہنچا اور اس

شہر کی عمارتوں اور نخلستانوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اس کے اس عہدِ زریں میں کھو گیا۔ جبکہ میرے نانا اس شہر کے محکمہ بندوبست میں ملازم تھے اور آپ نے میرے مرشد و مولیٰ کی کتاب براہین احمدیہ کی خریداری کے لئے اپنا نام پیش کیا تھا۔ مجھے اس وقت ان مردانِ خدا کا بھی خیال آیا جو مختلف علاقوں میں اپنی عمرِ عزیز گزارنے کے بعد اب زیرِ زمین آرام کر رہے ہیں۔ یہ شہر اگرچہ انسانوں کی نسبت زیادہ پائیدار ہیں مگر مختلف ممالک کے ویران کھنڈرات جو کہیں بابل و نینوا اور کہیں ہڑپہ و ٹیکسلا کے نام سے موسوم ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ باقی من کل فانی کوئی لفاظی نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کا اظہار ہے۔

میں انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں حیات و زیست کی گتھیاں سلجھا رہا تھا کہ اچانک گاڑی کی تیز روی نے خرامِ ناز کی صورت اختیار کر لی۔ کھڑکی سے جھانکنے پر معلوم ہوا کہ سامنے تریموگھاٹ ہے۔ یعنی چناب و جہلم کا سنگھم۔ اور طوفانِ آب کی وجہ سے ریل کا پل گاڑی کی تیز روی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ خیر گاڑی آہستہ آہستہ پل پر سے گزری اور میں نے اس سیل و تلاطم کا اندازہ لگایا جس نے لاہور کی بجائے مجھے براستہ کندیاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ اس طوفانِ آب کو دیکھ کر مجھے وہ ہیبت ناک پیشگوئی یاد آ گئی، میرے مقدس پیشوا نے اہلِ ملک کو مخاطب کرتے ہوئے کی تھی:۔

''میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اس ملک کی نوبت بھی قریب آتی جاتی ہے۔
نوح کا زمانہ تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گا..........۔'' الخ

الغرض میں ملتان سے ہوتا ہوا لودھراں پہنچا۔ چونکہ پیرزادہ صاحب کی رہائش گاہ یہاں سے قریب، بلکہ گجرات کی نسبت قریب تر تھی اس لئے مجھے اس وقت عرب کے ایک بادیہ نشین کا شعر یاد آ گیا۔

لِكُلٍّ تَدَاوِيْنَا وَذَالِكَ لَمْ يَكُنْ
اَلَا اِنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَيْرٌ مِنَ الْبُعْدِ

ترجمہ: ہم نے دور و نزدیک رہ کر مرض محبت کا علاج کیا ہے۔ سچی بات یہی ہے کہ محبوب کا قرب اس کے بُعد سے زیادہ اچھا ہے۔

پیرزادہ صاحب کی جائے سکونت موضع گوگڑاں جانے کے لئے میں اڈے پر کھڑا اس وقت لاری کا انتظار کر رہا ہوں اور طوفانِ گرد و غبار سے اپنی نظروں کا دامن بچا رہا ہوں۔ اس گرد و غبار کی فراوانی اور اپنی دامن کشی کو دیکھ کر مجھے اس عالمگیر کی صاحبزادی زیب النساء مخفی کا شعر یاد آ رہا ہے۔

آہستہ بگذری چو رسی بر مزارِ من
شاید بدامنت بنشیند غبارِ من

میں اسی طرح عالم تصور میں اپنے عہدِ ماضی کا تماشا کر رہا تھا کہ معلوم ہوا اب موضع مذکور میں کوئی لاری نہیں جائے گی۔ اس لئے ناچار مجھے پا پیادہ چلنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور میں

گوگڑاں کا راستہ پوچھ کر اس دریائے گرد وغبار میں کود پڑا۔ اس علاقہ کا ماحول اور لوگوں کی طرزِ رہائش کوئی ایسی دلکش نہیں ہے البتہ جابجا اونٹوں کی قطاریں اور بان اور پیلو کے پیڑ دیکھنے سے خطۂ عرب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ میں ان اونٹوں کی بلبلاہٹ اور ان کے زنگولوں کی جھنکار میں اس ریگ زار کو طے کر رہا ہوں اور ان پیڑوں کو دیکھ کر ایک آشفتہ مزاج اعرابی کے اس غزلیہ کو گنگنا رہا ہوں۔

رَعَاکَ اللّٰہُ یَا سَلْمٰی رَعَاکَ

وَدَارَکِ بِاللَّوٰی ذَاتَ الارَاکِ

قَتَلْتُ بِفَاحِمٍ وَبِذِی غُرُوبٍ

اَخَا قَوْمٍ وَّمَا قَتَلُوْا اَخَاکِ

اس وقت خطۂ گرد وغبار انسانی تگ ودو سے آرام پانے کے لئے تاریکیٔ شب کی چادر اوڑھ کر ستانے کی تیاری کر رہا ہے۔ سامنے سے آنے والے آدمی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان گھنے درختوں کی اوٹ میں اونچی اونچی عمارتیں اسی قصبہ کی ہیں جو میری منزل مقصود ہے۔ چنانچہ میں اس خیال سے کہ اب کاروانِ جستجو چشمۂ مراد پر پہنچ کر اپنی تشنگی بجھانے کو ہے مطمئن ہو چکا ہوں اور گوگڑاں میں داخل ہو کر یہاں کے رئیس مرزا نیک محمد چغتائی کے پاس بیٹھا ہوں۔ مرزا صاحب موصوف جو اس وقت موضع مذکور میں تخمیناً پانچ ہزار ایکڑ اراضی کے مالک ہیں نہایت متواضع اور خلیق انسان ہیں۔ چونکہ آپ عمو صاحب سے رشتۂ عقیدت

رکھتے ہیں اس لئے یہ بات معلوم ہونے پر کہ میں ڈیرہ میاں صاحب سے آیا ہوں بہت خوش ہیں۔آپ دراصل شہر حصار کے باشندے ہیں اور آپ کا خاندان شاہانِ تغلق کے زمانہ سے مسندِ اقتدار پر فائز چلا آتا ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ تقسیم ہند کی گزشتہ آشوب کاری نے آپ کے خاندان کے اکثر افراد کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر اس خاندان کا ایک نادر کتب خانہ بھی تلف کر دیا ہے۔ مرزا صاحب موصوف کا کہنا ہے کہ اس کتب خانہ میں تقریباً بارہ ہزار ایسی کتابیں تھیں جن کا کسی دوسری جگہ ملنا محال ہے۔

آپ سے دورانِ گفتگو میں اور بھی کئی حقائق کا علم ہوا مگر پیرزادہ صاحب کی عدم موجودگی نے میرے قصرِ مساعی کو متزلزل کر دیا اور میں پھر اسی باطنی کشمکش میں الجھ گیا جو اس قصبہ کے ورود سے پہلے لاحق تھی۔ مرزا صاحب بضد ہیں کہ میں عرصۂ دراز تک ان کی محفلِ طرب ونشاط میں شریک رہوں مگر میں پیرزادہ صاحب کی جستجو کے لئے بے قرار ہوں۔ آخر بڑے ردوکد کے بعد دو دن کے وقفہ قیام پر اتفاق ہوا اور اس کے بعد میں چک اوڈانوالہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

مرزا صاحب موصوف نے لاری میں سوار کرانے کے لئے اپنے ایک ملازم کو میرے ساتھ کر دیا مگر اڈے پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ لاری ایک بجے سے قبل نہیں مل سکتی۔ ناچار میں اپنے عزائم جفاکشی کو ایڑ لگاتے ہوئے پاپیادہ روانہ ہو گیا۔ طوفانِ آب کی وجہ سے چونکہ گاڑیوں کی

آمدورفت بے قاعدہ ہوگئی تھی اس لئے میرا کشتیِ حیات کو اس ریگِ رواں کے سمندر میں ڈال کر ساحلِ لودھراں پر لگانا بہت مفید ثابت ہوا۔

اس وقت جبکہ دن کے تقریباً بارہ بج چکے ہیں گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہے اور میں ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو چکا ہوں۔ یہ گاڑی چونکہ جہانیاں کی راہ سے خانیوال جارہی ہے اس لئے ضلع ملتان کے ایک دوسرے علاقہ کے دیکھنے کا موقع میسر آ گیا ہے۔ خانیوال پہنچنے پر معلوم ہوا کہ چیچہ وطنی جانے والی گاڑی رات کے نو بجے روانہ ہوگی۔ چنانچہ اس عرصۂ قیام میں فریضۂ نماز کی ادائیگی اور اکلِ طعام سے فراغت حاصل کی اور وقتِ مقررہ پر گاڑی میں سوار ہو گیا۔

خدا خدا کر کے چیچہ وطنی کا اسٹیشن آیا اور میں گاڑی پر الوداعی نظر ڈال کر اس کے مسافر خانہ میں فروکش ہو گیا۔ اس جگہ لوگوں کا کافی اژدھام ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام کا تمام ہجوم ایسے خستہ حال مسافروں پر مشتمل ہے جو طوفانِ آب کی وجہ سے بے گھر ہو چکے ہیں۔ اعمالِ انسانی کی پاداش کا یہ منظر بے حد دردناک ہے اور سیلاب کی تباہ کاریوں کی تفصیل سن کر طوفان نوح کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

میں رات بھر انہیں حالات پر غور کرتا رہا اور صبح ہوتے ہی پیرزادہ صاحب کے چک کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پیرزادہ صاحب کل سے منڈی بوریوالہ جا چکے

ہیں۔ بہرحال تعارف کرانے پر ان کے خسر سید بہادر علی شاہ صاحب نے مجھے پہچان لیا اور حسب دستور بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ آپ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پیرزادہ صاحب کل تک ضرور آجائیں گے۔ چنانچہ میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور آپ میرے آذوقہ و طعام کی تیاری کے لئے اندورنِ خانہ تشریف لے گئے۔ الحمدللہ کہ میں ابھی کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ پیرزادہ صاحب آگئے۔

اب میری قوت متخیّلہ ''اندیشہ ہائے دور و دراز'' کی بجائے اس گاؤں کے محلِ وقوع اور دریائے راوی کے اس عذاب سیال پر غور کررہی ہے۔ اور میں اس بات پر حیران ہورہا ہوں کہ وہ اَرحم الراحمین خدا آج اتنا سخت گیر کیوں ہوگیا ہے کہ نوعِ انسان کو اس کی بداعمالیوں کی سزا ایسے عذابوں سے دے رہا ہے جن کا وجود معمورۂ دنیا پر اس سے قبل اس رنگ میں محیط نہیں تھا۔ اور پھر اس واہمہ کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ جب ہر فردِ بشر اپنی املاک کے تحفظ کا حق رکھتا ہے تو اللہ میاں اس بات کا کیوں حق نہیں رکھتا کہ اس کی مخلوق جو اسی کی ملکیت ہے جب اس کا آستانہ چھوڑ کر خواہشاتِ نفسانی کی غلام بن جائے تو اس کی گوشمالی نہ فرمائے اور ایسے ذرائع استعمال نہ کرے جن کے توسط سے پھر قلوبِ انسانی پر اس کی حکومت قائم ہوجائے۔

لَا یَسْلِمُ الشَّرَفُ الرَّفِیْعُ مِنَ الْاَذٰی حَتّٰی

یُرَاقَ عَلٰی جَوَانِبِہِ الدَّمُ

دنیا میں کوئی بزرگی بھی دکھ سے محفوظ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے اردگرد خون کی بھینٹ نہ چڑھائی جائے۔

میں انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا قرآن مجید کے ان مضامین کی گہرائیوں میں اتر گیا جو اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ اور وَمَا ظَلَمْنَا ھُمْ کے الفاظ میں پوشیدہ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ خیر الراحمین ذات کسی پر ظلم نہیں کرتی بلکہ یہ مصائب و شدائد ہماری اپنی ہی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔

رام جھروکے بیٹھ کے سب کا مجرا لے
جیسی جاکی چاکری ویسا وا کو دے

کیا وہ خدا جو نوح علیہ السلام کو طوفانِ آب سے اور ابراہیم علیہ السلام کو آتشِ نمرود سے اور موسیٰ علیہ السلام کو سمندر کے تلاطم سے اور ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے اعمالِ حسنہ کی وجہ سے مکہ کے خونخوار دشمنوں سے نجات دے سکتا ہے اب زندہ نہیں؟ یقیناً وہ اب بھی زندہ ہے اور اسی طرح معجزات دکھانے پر قادر ہے مگر ہمارے اعمال میں وہ صلاحیت باقی نہیں رہی۔

کاش یہ دربدر ٹھوکریں کھانے والی مخلوق اس کے آستانے پر جھک کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے ورنہ وہ عذاب جو معمورۂ دنیا کو اس سے قبل کئی دفعہ مٹا کر صحراؤں میں تبدیل کر چکا ہے اس کی آمد آمد کوئی دور نہیں۔

آج پیرزادہ صاحب مجھے چیچہ وطنی سے ہڑپہ کے آثارِ قدیمہ دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ یہ کھنڈر جو آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں میرے دوش وامروز کے حالات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ میں اس شہر کے اجڑنے ہوئے اناج گھر، شکستہ عبادت خانے اور بے آب کنویں دیکھ رہا ہوں۔ اور مجھے اس بستی کا خیال آرہا ہے جسے بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے گوشت پوست کے مواد سے اَحْسَنِ تَقْوِیْم میں تیار کیا اور پھر حیات و بقا کے دریچوں کو کھول کر اس کی روح کے ایوان میں جلوہ افروز ہوا اور اس بستی کا نام حضرتِ انسان تجویز فرمایا۔ ناگاہ اس بستی کی خلوت گاہوں سے خواہشاتِ نفسانی کے اندرونی دشمن نے بغاوت کی اور شیطان کے بیرونی غنیم کو اس بستی پر شبخون مارنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ ایک لشکرِ جرار کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا اور اس کے گراں بہا دفینوں کو لوٹ کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا گیا۔ اب وہی بستی جو کل بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا کا بڑا بول بول رہی تھی آج خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کا درسِ عبرت پیش کر رہی ہے۔ اور میں ان کھنڈرات پر کھڑا کھڑا سوچ رہا ہوں کہ ان دونوں بستیوں میں سے کون سی بستی زیادہ قابل رحم اور لائق

عبرت ہے۔ آیا وہ جسے نوعِ انسان نے آباد کیا تھا یا وہ جسے احسن الخالقین نے اپنے دستِ راست سے تعمیر فرمایا تھا؟

آج ہم منٹگمری سے ہوتے ہوئے اوکاڑہ پہنچ کر ملک عطاء الرحمٰن خاں علوی کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ عزیز میرا عہد گزشتہ کا پرخلوص دوست ہے۔ اور دوست کی خدمت کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی مجھے ذوق مرحوم کا یہ شعر یاد آ گیا۔

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

رات اوکاڑہ میں گزارنے کے بعد آج ہم دیپالپور سے ہوتے ہوئے موضع سبحان شاہ پہنچ چکے ہیں۔ راستے میں پانی کا وہ خطہ جو اوکاڑہ اور دیپالپور کے مسافروں کے لئے سدِ راہ بنا ہوا ہے نظر آ رہا ہے۔ یہ پانی تقریباً ایک میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے اور تین فٹ سے گیارہ فٹ کی بلندی تک بہتا ہوا اس علاقہ کی فصلوں اور مکانوں کو غرقاب کر چکا ہے۔ لاریاں پانی کے دونوں کناروں پر کھڑی ہو کر سواریوں کو اتار دیتی ہیں اور مسافر اپنی چادروں اور پائجاموں کو اٹنگ کر اس دریائے نوزائیدہ میں کود پڑتے ہیں۔ درمیان کے زیادہ گہرے حصے کو عبور کرنے کے لئے چونکہ کشتیوں کا انتظام موجود ہے اس لئے مسافر اس نیم شناوری کے بعد ان کشتیوں کے ذریعے ساحلِ عافیت پر پہنچ جاتے ہیں۔

موضع سبحان شاہ میں چندروز قیام کرنے کے بعد آج پھر ہمارے عزمِ رحیل نے خیمۂ قیام کی طنابیں اکھاڑی ہیں اور ہم رختِ سفر باندھ کر موضع پانا مہار کی طرف مہار اٹھا رہے ہیں۔ یہ موضع چونکہ ستلج اور بیاس کے سنگھم پر واقع ہے اس لئے ہمیں پھر دیپالپور سے گزرنا پڑا۔ دیپالپور جو اس وقت ضلع منٹگمری کی ایک تحصیل ہے بہت پرانا شہر ہے۔ جسے کسی زمانہ میں دیپال نامی ایک ہندو نے آباد کیا تھا اور اس کے بعد عبدالرحیم خانخاناں نے اس جگہ ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔

اس شہر سے گزر کر ہم بصیر پور پہنچے۔ یہ قصبہ اچھا بارونق ہے اور یہاں سکھوں کے عہدِ حکومت کا بنا ہوا ایک قلعہ بھی موجود ہے۔ آج کل سیلاب کی وجہ سے گاڑیوں کی آمد و رفت تو بند ہے مگر آس پاس کے قصبات سے تانگے آتے رہتے ہیں۔ یہ علاقہ بھی طوفانِ آب کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہ سکا اور لوگ اپنے اپنے دیہات میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس وقت دریائے ستلج کا طاس اور اس میں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی چاندنی عجیب سماں دکھا رہی ہے میں اور پیرزادہ شاہ حسن اور نور محمد جویا دریا کے اس بند پر جا رہے ہیں جو ہیڈ سلیمانکی سے موضع دُلّا تک دس بارہ میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس دریا کا دوسرا کنارہ چونکہ ہندوستان میں شامل ہے اس لئے رات کے سناٹے اور درختوں کے سائے میں مجھے وہ گزرا ہوا زمانہ یاد آ رہا ہے جبکہ ہم اس پار بود و باش رکھتے تھے۔ اور ہمارا دل و دماغ دنیاداری

کی موجودہ کاوشوں سے پاک تھا۔ اس وقت کے وہ زریں لمحات جو میری موجودہ مصیبتوں اور دکھوں کا موجب ہوئے ہیں ایک ایک کر کے میرے سامنے آرہے ہیں اور میں اپنی عمرِ عزیز کے اس حصہ پر آنسو بہا رہا ہوں۔ کاش زمانہ کی گردشیں میرے جامۂ اعمال سے ان دھبوں کو صاف کر دیں جن کے ہونے کی حسرت مجھے نہ ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔

اے دریائے نیلی کے گھنے درختو!

کیا وہ زمانہ پھر بھی آسکتا ہے جو میں نے آج سے نو دس سال پہلے اس خطۂ پاک میں گزارا تھا جو تمہارے میدانوں کا جنت نظیر خطہ ہے؟

اے گردشِ افلاک کے مالک! مجھ پر رحم کر۔ اے تقدیروں کو بدلنے والے! میری حالتِ زار کو دیکھ۔ مجھے تیری ذات کی قسم ہے کہ میں اپنی زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ تجھے تیری رحمت کا واسطہ ہے کہ میرے گناہوں کو بخش دے اور اب مجھے اپنی رحمت کے سایہ[1] میں لے لے۔ یہ دنیا دنیا والوں کو مبارک ہو۔ میں تجھ سے صرف اپنے گناہوں کی بخشش اور قبر کی دو گز زمین مانگتا ہوں۔ واحسرتا کہ

[1] (یہ عجیب بات ہے کہ اس دعا کے کچھ عرصہ بعد ہی آپ بعمر ۴۷ سال ۲۶ رفروری ۱۹۵۹ء کو وفات پاگئے اور بہشتی مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔)

لکڑی جل کوئلہ بنی کوئلہ بنا جل راکھ
میں پاپن کچھ ایسی جلی نہ کوئلہ بنی نہ راکھ

اس وقت رات کے نو بجے کا وقت ہو چکا ہے اور ہم موضع پانا مہار میں داخل ہو کر پیرزادہ صاحب کے خواہرزادہ سید مظفر علی صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ موضع اگرچہ دریا کے کنارے پر واقع ہے مگر کشتیٔ نوح کی طرح طوفانِ آب کی زد سے محفوظ ہے۔ معلوم نہیں اس کی اصل وجہ اس بند کی فصیل ہے یا اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی۔ بہرکیف ایسے خطرناک سیلاب میں اس گاؤں کا غرقابی سے بچ رہنا اس کے فضلوں سے خالی نہیں۔ یہ موضع پیرزادہ صاحب کے تایا سید حسن علی صاحب کی وجہ سے اس نواح میں کافی مشہور ہے۔ سید صاحب مرحوم بہت بڑے عالم تھے اور کئی ایک کتابوں کے مصنف بھی۔ میں نے آپ کی ایک کتاب 'صادق الجواب' کے بعض حصوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب سے آپ کی علمی قابلیت اور تنقیدی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ؎

کاغذ لکھیا جگ رہے جے لکھ جانے کو
لکھن ہارا با پڑا گل گل مٹی ہو

اس وقت چاند کی دودھیا کرنیں اس بستی کے لوگوں کو تھپک تھپک کر سلا رہی ہیں اور ہماری مجلس میں بیٹھنے والے بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔ سید مظفر علی صاحب چونکہ

شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے فریضۂ خفتن سے قبل بعض ایسے دعائیہ اشعار کا ورد کر رہے ہیں جو شیعوں کے نزدیک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے سوتے سوتے ان اشعار کو سنا اور ان کی دردناک مناجات سے کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِ فَرِحُوْنَ کا اندازہ لگایا۔ آپ نے نعرۂ حیدری لگانے کے بعد سب سے پہلے یہ شعر پڑھا۔

ساماں شتاب کردے میرے دل کے چین کا
پروردگار واسطۂ خونِ حسین کا

اس کے بعد ایک لمبی مناجات پڑھی اور پھر یا شبیر! دو جہاں کے پیر، کا ایک ہلکا سا نعرہ لگایا اور سونے کے لئے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد مرغِ سحر نے ہمیں بیدار کر دیا۔ اس وقت سید صاحب موصوف انہیں ببولوں کے نیچے جہاں رات بھر ہم نے کسی شاعر کے اس شعر کی داد دی تھی کہ

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

چولہا دہکا کر اس پر چائے کی کیتلی رکھ رہے ہیں۔ شبِ ماہتاب میں ان کے اس اہتمامِ خاص نے اس وقت وہ سماں باندھا ہے کہ خاقانِ چین کے باورچی خانے بھی ماند پڑ گئے ہیں۔ میں لحاف اوڑھے ہوئے اس آتشِ سیال کا انتظار کر رہا ہوں جس میں اہل کابل

کے نزدیک لب بندی، لب سوزی، لب دوزی اور لبریزی کے خصائص کا ہونا ضروری ہے۔

الغرض اس چائے نوشی کے بعد میں اور پیرزادہ صاحب اس گاؤں پر الوداعی نظر ڈال کر موضع حویلی کی طرف چل پڑے۔ موضع حویلی پہنچ کر ہم نے موضع محبّ علی کی راہ لی۔ چونکہ سیلاب کی وجہ سے سڑک ٹوٹ چکی ہے اس لئے یہ سفر بھی ہمیں پاپیادہ کرنا پڑا۔ موضع مذکور کا منظر ایسا دلخراش ہے کہ دیکھا نہیں جاتا۔ جس طرف نگاہ اٹھائیں تباہی کے نشانات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں کے رئیس میاں گوہر علی صاحب وٹو اور ان کے برادرِ خورد میاں محبوب علی صاحب چونکہ نہایت غریب پرور انسان ہیں اس لئے انہوں نے مزارعین کو اس طوفانِ آب کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان خانماں برباد لوگوں میں سے اکثر افراد کا سامانِ خورونوش اور اخراجات علاج معالجہ یہ ہر دو رئیس اب بھی اپنی جیب سے ادا کر رہے ہیں۔

رات موضع مذکور میں گزارنے کے بعد علی الصبح ہم موضع رتیکے روانہ ہو گئے۔ یہ موضع چونکہ دریائے نیلی کے کنارے پر واقع ہے اس لئے طوفانِ آب کے وہ آثار جو ایسی جگہوں میں متوقع ہو سکتے ہیں راستے میں نظر آتے رہے۔

اب میں اور پیرزادہ صاحب موضع مذکور میں پہنچ چکے ہیں اور میاں محمد امیر صاحب وٹو کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ میاں صاحب موصوف اور ان کے برادران جو اس علاقہ میں

تقریباً دو ہزار ایکڑ اراضی کے مالک ہیں۔ دراصل ریاست بیکانیر کے باشندے ہیں اور علمی و ادبی اوصاف کے علاوہ تواضع اور مہمان نوازی کی امتیازی خصوصیات سے بھی آراستہ ہیں۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ محمد امیر صاحب نمبردار میرے برادر عزیز میاں عزیز احمد صاحب راجیکی سے بھی تعارف رکھتے ہیں۔

نمبردار صاحب مذکور نے بتایا کہ اس طغیانی کے دوران میں جبکہ پانی چاروں طرف سے اس موضع کا محاصرہ کر چکا تھا یہاں کے اکثر لوگ دس روز تک بلا خواب و خورش اس کے دفاع کی کوشش کرتے رہے مگر پانی کے ریلے کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی۔ جب اس گاؤں کی تھکی ہاری سپاہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئی تو آسمان سے اس کی رحمت کے فرشتے اترے اور انہوں نے اس بپھرے ہوئے دشمن کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ اب وہی سیلاب جو دس بارہ فٹ کی بلندی تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ کا دعویٰ کر رہا تھا نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ مجھے اس طوفانِ آب کی غارت گری دیکھ کر اس وقت گورو بابا نانکؒ کے مندرجہ ذیل اشعار یاد آ گئے ۔

کُوڑ رَاجہ کُوڑ پَرجا کُوڑ سب سنسار　　　کُوڑ منڈپ کُوڑ ماڑی کُوڑ بیسن یار
کُوڑ سونا کُوڑ رُوپا کُوڑ پہنن ہار　　　کُوڑ کایا کُوڑ کپڑ کُوڑ روپ اُپار
کُوڑ میاں کُوڑ بی بی کھپ کے ہوئے خوار　　　کُوڑ کُوڑے نیہوں لگاّ وِسریا کرتار
کِس نال کیجے دوستی سب جگ چلن ہار

میں ان اشعار کو پڑھ رہا ہوں اور کُلُّ شَیءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجھَہٗ کے آئینہ میں اس فانی دنیا کے فانی کارناموں کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ تازیانۂ عبرت اگرچہ پندنامہ عطار سے کچھ کم سبق آموز نہیں مگر کسی شخص کا اس سے نصیحت حاصل کرنا اس کے فضلوں پر منحصر ہے۔

آج موضع مذکور سے واپس آ کر میں اور پیرزادہ صاحب موضع کمہاری والا جا رہے ہیں۔ یہ موضع کمہار قوم کی ایک نیک دل عورت کی وجہ سے کمہاری والا کہلاتا ہے۔ چونکہ اس موضع کے ایک مہاجر لکھمیر خان چوہان سے پیرزادہ صاحب کے دیرینہ مراسم ہیں اس لئے پاکپٹن جانے کی بجائے رات ہمیں یہیں قیام کرنا پڑا۔ بابا لکھمیر خاں اگرچہ اس وقت نہایت عسرت سے زندگی بسر کر رہے ہیں مگر مہمانوں کی تواضع کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ہمارے آنے پر آپ نے سب سے اول چائے کا انتظام کیا۔ اور پھر پیرزادہ صاحب کے کہنے پر کہ یہ قندِ سیاہ کی چائے نہیں پیا کرتے میرے لئے الگ نمکین چائے تیار کی۔

چائے آنے پر اس کی مہک سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس وقت کمہاری والا ضلع منٹگمری میں نہیں ہوں بلکہ حکیم رحمت اللہ صاحب گورداسپوری کے پاس بیٹھا دردِ شکم کا جوشاندہ پی رہا ہوں۔ کیونکہ بابا لکھمیر خاں نے ایک ماشہ پتی کے ساتھ بادیاں اور شیر گاؤمیش اور آبِ زلال کی اس طرح آمیزش کی تھی کہ اس ترکیب خاص کو حکیم جالینوس بھی نہ سمجھ سکے۔ میں نے جب اس صدری نسخہ کی تفصیلات دریافت کیں تو آپ نے اس کے قیمتی اجزاء اور حتمی فوائد پر ایسی برجستہ تقریر فرمائی کہ سامعین عش عش کر اٹھے۔ مجھے اس پر خیال آیا کہ چائے کی عام

شہرت کے لئے یہ کیمیاوی مرکب بہت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ لیکن اسی اثناء میں برادرم مولوی چراغ دین، لالہ عبدالرحمٰن، لالہ عبداللہ جان، لالہ عطاء اللہ بھٹی اور چوہدری عبدالعزیز کی بزمِ چائے نوشی یاد آ گئی اور خیال آیا کہ ہم ایسے بلانوشوں کی موجودگی میں چائے کی مارکیٹ کو فیل کرنا بابا لکھمیر خاں کے بس کا روگ نہیں۔ اللہ اللہ وہ بھی کیا دن تھے جب ہماری محفل میں اس جامِ ارغواں کا دور چلتا تھا اور پھر اس کی تیزی اور خوشبو کے لئے زعفران کے حوالے دیئے جاتے تھے۔ اس وقت کی چائے جو خونِ کبوتر اور شنگرفِ رومی کے ہم رنگ ہوا کرتی تھی آج کہاں!—— آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نَے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آج میں اور پیرزادہ صاحب پاکپتن جا رہے ہیں۔ یہ جگہ حضرت باوا فریدالدین گنج شکر کی وجہ سے کبھی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس شہر کا محل وقوع اس طائر لاہوت کی طرح زمین کی عام سطح سے اس قدر بلند ہے کہ میل ہا میل کی مسافت سے نظر آ رہا ہے۔ اس خطۂ پاک کو دیکھتے

ہی میں نے اپنے خانۂ دل میں ایسی شعاعوں کو محسوس کیا جن کے فیضان سے روح کی ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔ ہم اس بلدۂ مطہر کے ایک بازار سے ہوتے ہوئے میاں خوشی محمد وٹو کے پاس پہنچے۔ کھانا تناول کرنے کے بعد پیرزادہ صاحب نے اس آستانۂ پاک پر جانے کی فرمائش کی جس کی زیارت کے لئے میں عہدِ طفولیت سے بے چین تھا۔ چنانچہ میں اسی وقت اٹھا اور پیرزادہ صاحب کی معیت میں بابِ فردوس پر پہنچا۔ اس دروازے میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی بے بضاعتی کے ساتھ اس مردِ خدا کے فیضِ عام کا خیال آیا جس نے اپنی اکسیر گرنگاہ سے لاکھوں انسانوں کو کندن بنا دیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں دعا میں مشغول ہو گیا اور دیر تک وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ کے ماتحت آپ کے توسط سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

الغرض آستانۂ پاک کی زیارت کے بعد ہم ڈاکٹر فلک شیر صاحب کے پاس پہنچے۔ آپ چونکہ خواجہ نظام الدین صاحب تونسوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہیں اس لئے رات گئے تک انہی کی مدح سرائی کرتے رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بزرگ سے عقیدت رکھنا بہت اچھی بات ہے مگر مذہبی دنیا میں محض عقیدت ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کسی باخدا کہلانے والے کے اعمال کیسے ہیں اور اس نے کہاں تک خدا تعالیٰ کی نصرت حاصل ہے۔

وَکُلٌّ یَدَّعِی وَصلاً بِلَیلٰی
وَلَیلٰی لَا تُقِرُّ لَھُم بِذَاکَ

ہرایک لیلیٰ کے وصل کا مدعی ہے مگر لیلیٰ ان میں سے کسی کے وصال کا اقرار نہیں کرتی۔

آج میں اور پیرزادہ شاہ حسن میاں خوشی محمد کی معیت میں چک نمبر ۳۹ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ مگر گاڑی میں بیٹھتے ہی اس خطۂ پاک کی محبت نے میرے دل میں پھر انگڑائی لی اور میرا دل مضطرب جو اس بلدۂ مطہر کی زیارت سے اپنے بہت سے ہموم وغموم فراموش کر چکا تھا پھر مچل گیا۔ اچھا اے پاکپتن! خدا حافظ۔ تیرے خطۂ پاک میں جہاں اپنے زمانہ کا سب سے مقدس انسان وارد ہوا تھا آج اس میں اپنے زمانہ کا سب سے گنہگار داخل ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ چکا ہے۔ کاش تیرا روضۂ اطہر اور اس میں آرام کرنے والی روحِ پاک خدا تعالیٰ کے حضور اس کی سفارش کرے اور وہ پھر حقِ عبودیت ادا کرنے کے قابل ہو جائے اور پھر اپنی فردوسِ گم گشتہ کو حاصل کر سکے۔ لیکن آہ! ؎

ندی کنارے میں کھڑی پانی جھلمل ہو
میں میلی پیا اجلے میرا کس بدھ ملنا ہو